جہاد بالقرآن

صدر مؤسس مرکزی انجمن محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ایک جامع خطاب

© rasailojaraid.com

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی ..... امّا بعد:

فاعوذ باللہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بسم اللہ الرَّحمٰن الرَّحیم

﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ صدق اللّٰہ العظیم

خطبۂ مسنونہ، تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد:

جس آیتِ مبارکہ کی میں نے تلاوت کی ہے، اس میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں۔ ایک لفظ ''جہاد'' جو اِس آیتِ مبارکہ میں دو مرتبہ آیا ہے، ایک فعل امر کے طور پر ''جَاهِدْ'' اور دوسرے مفعول مطلق کے طور پر ''جِهَادًا كَبِيْرًا'' —— یعنی نہ صرف جہاد بلکہ شدید جہاد، بہت بڑا جہاد۔ یہاں دوسرا اہم لفظ ''بِهٖ'' آیا ہے۔ اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ''آپؐ ان سے جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

یہاں ''بِهٖ'' کا جو چھوٹا سا ٹکڑا آیا ہے، میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے اہلِ علم حضرات بھی اس کی اہمیت پر غور و فکر کیے بغیر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جہاں بھی قرآن کے لیے ''بِهٖ'' بطور ضمیر مجرور آیا ہے، ہمارے اہلِ علم، اِلّا ماشاء اللہ، اس کا حق ادا نہیں کرتے۔

اس ''بِهٖ'' کی اہمیت کے اظہار کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

© rasailojaraid.com

پہلی مثال سورۂ بنی اسرائیل سے ہے‘ جہاں فرمایا:﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ﴾ ’’اور (اے نبیﷺ!) کچھ رات جاگتے رہیے اس (قرآن) کے ساتھ‘ یہ بڑھوتری ہے آپؐ کے لیے‘‘۔ میرا اندازہ ہے کہ تہجد کی فضیلت‘ اس کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ تو ہمارے یہاں معروف اور مشہور ہے‘ کسی کو اس کی توفیق ملی ہو یا نہ ملی ہو‘ لیکن اس کی عظمت اور برکات سے ہر وہ مسلمان بخوبی واقف ہوگا جس کا تھوڑا بہت بھی دینی مزاج ہے۔ لیکن یہاں بھی ’’بِہٖ‘‘ پر اتنی توجہ نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے۔ تہجد میں اہم ترین شے قیام‘ وہ بھی طویل قیام‘ اور اس میں ترتیل کے ساتھ تلاوتِ قرآن ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۙ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۗ﴾ (المزمل)

’’اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو‘ مگر کم‘ آدھی رات‘ یا اس سے کم کرلو‘ یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو‘ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔‘‘

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں عموماً وہ عام نوافل کی طرح آٹھ رکعتیں پڑھ لیتے ہیں‘ پھر بیٹھ کر مختلف اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں اور زیادہ وقت اس میں صرف کرتے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے‘ لیکن اس کی برکات سے کما حقہٗ استفادہ تب ہوگا جب اِس میں طویل قیام ہو اور اس میں ترتیل کے ساتھ قرآنِ مجید کی تلاوت ہو۔

دوسری مثال سورۂ مریم کی ہے‘ جہاں فرمایا:

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝﴾

’’پس یقیناً (اے نبیﷺ!) اس کلام کو ہم نے تمہاری زبان میں آسان کر کے نازل کیا ہے‘ تا کہ تم اس (قرآن) کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو اس کے ذریعے سے خبردار کر دو۔‘‘

یہاں بھی غور فرمایئے کہ تبشیر و انذار کے لیے قرآن مجید ہی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے! لیکن ہوتا کیا ہے! یہ کہ ہمارے یہاں وعظوں اور خطبوں میں اکثر و بیشتر یہ کام

© rasailojaraid.com

اولیاءاللہ کے تذکروں یا مولانا رومؒ کی مثنوی سے لیا جاتا ہے۔ قرآن کی طرف بہت ہی کم توجہ دی جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ زیر نظر آیتِ کریمہ کا ہے: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ معلوم ہوا کہ یہاں جس جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے اس شدّ ومدّ کے ساتھ‘ اس اہتمام کے ساتھ‘ اس تاکید وزور (emphasis) کے ساتھ‘ تو اس کے لیے ایک ذریعہ‘ ایک آلہ‘ ایک ہتھیار ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک تلوار ہے جو آپؐ کے دستِ مبارک میں تھمائی گئی ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ لہٰذا ارشاد ہوا: ’’اور (اے نبیؐ!) ان (مشرکین وکفار) کے ساتھ جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد‘‘۔

جہاد اور قرآن: دو مظلوم ترین حقیقتیں

© rasailojaraid.c

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل یہاں لفظ ’’جہاد‘‘ کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ پہلی بات یہ کہ میرے نزدیک جہاد ہمارے دین کا مظلوم ترین تصور (concept) ہے۔ مظلوم ہونے کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ دوسری شے جو آتی ہے وہ قرآن ہے۔ ہمارے دین کی یہ دو مظلوم ترین حقیقتیں ہیں۔ جہاد کے بارے میں اتنے مغالطے ذہنوں میں ہیں کہ حد و شمار نہیں۔ پھر خاص طور پر ہماری تاریخ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ جب ہم براہِ راست محکوم ہوئے‘ نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی وفکری اعتبار سے بھی۔ یعنی ہم دوطرفہ غلامی کے پنجے میں گرفتار ہوئے۔ اُس وقت اہلِ مغرب کی طرف سے ہم پر جہاد کے حوالے سے بڑے جارحانہ حملے ہوئے اور استہزاء وتمسخر کا معاملہ ہوا۔ انہی کا یہ الزام ہے کہ: ع ’’بوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے!‘‘ چنانچہ اس ضمن میں ہمارا انداز معذرت خواہانہ (apologetic) رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اب یہ دَور اصلاً گزر چکا ہے‘ لیکن تاحال اس کے باقیات السّیئات کچھ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں‘ اور جب تک ہم اُن کو اچھی طرح کھرچ نہیں دیں گے اُس وقت تک دین کی کوئی مثبت‘ پائیدار اور فعال تحریک جو نتیجہ خیز بھی ہو‘

© rasailojaraid.c

اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ جہاد کے بارے میں سب سے پہلا مغالطہ ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا اور اس کے نتائج بہت دُور رس ہیں کہ جہاد کے معنی ''جنگ'' ہیں۔ اس بارے میں میری رائے ہے کہ اغیار اور بیگانوں کی کارستانی کے ساتھ ساتھ یگانوں اور اپنوں کی بھی غلطیاں ہیں۔ اپنوں کی بڑی اکثریت نے بھی جہاد کو ''جنگ'' ہی قرار دیا جب کہ قرآن مجید مستقل طور پر دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے' ایک ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور دوسری ''قتال فی سبیل اللہ''۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ہمارے دینی لٹریچر میں جنگ کے تمام مدارج و مراحل کے لیے بطورِ عنوان لفظ جہاد استعمال ہو جاتا ہے اور جنگ کو ''جہاد'' ہی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ہمارے ذہنوں میں جہاد اور قتال مترادف کی حیثیت سے جاگزیں ہو گئے اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ جہاد کے معنی جنگ ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر ہے جنگ ہر وقت اور ہمیشہ تو نہیں ہوتی' لہٰذا جہاد فرضِ کفایہ رہ گیا اور فرضِ عین کی فہرست سے خارج ہو گیا۔ جب کبھی جنگ کا مرحلہ آتا تھا تو جتنی نفری کی ضرورت ہوتی تھی وہ نکل آتی تو بقیہ لوگوں کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جاتا تھا۔ یہی فرضِ کفایہ کا تصور ہے اور بالکل صحیح تصور ہے۔ لیکن جہاد و قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے یہاں جو فقہی تصورات و معیارات اور سوچ کے جو پیمانے ہیں ان میں جہاد گویا صفِ اوّل کی شے رہا ہی نہیں۔ اس کا فرضِ عین ہونا پس منظر میں چلا گیا' حتیٰ کہ ذہنوں سے اُوجھل اور محو ہو گیا۔ اِلاّ ماشاء اللہ!

چوتھی بات یہ کہ اس پر ستم بالائے ستم اور بناء الفاسد علی الفاسد یہ ہوا کہ ہم نے یہ تصور کر لیا کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے تو گویا وہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان ذاتی حیثیت سے جہاں فاجر و فاسق ہو سکتا ہے وہاں ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ یا کوئی گروہ ظالم بھی ہو سکتا ہے اور ایک ناحق جنگ بھی شروع کر سکتا ہے' صرف اپنے مفادات کے لیے' صرف اپنے اقتدار کو

© rasailojaraid.com

وسعت دینے کے لیے' اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع کے لیے' جبکہ اُن کے پیشِ نظر دین کی کوئی خدمت نہ ہو' اعلائے کلمۃ اللہ کا کوئی مقصد نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی جنگ جہاد یا قتال فی سبیل اللہ کیونکر شمار ہو جائے گی' جبکہ ہمارے سامنے نبی اکرم ﷺ کی یہ واضح حدیث موجود ہے:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: الرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانُہٗ فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ قَالَ : ((مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ))

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا' اس نے دریافت کیا کہ حضور! ایک شخص جنگ کرتا ہے مالِ غنیمت کے لیے' ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنے ذکر اور شہرت کے لیے اور ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنی (یا اپنے قبیلہ کی) سربلندی دیکھنے کے لیے' تو کس کی جنگ اللہ کے راستے میں ہوگی؟ حضورؐ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا: ''صرف اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہوگی جو اس لیے جنگ کرے تا کہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔''

خیال رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ تو قتال فی سبیل اللہ وہ جنگ ہے جو اللہ کے جھنڈے کی سربلندی کے لیے کی جائے' نہ کہ ہر مسلمان کی یا مسلمانوں کی حکومت کی ہر نوع کی جنگ جہاد و قتال فی سبیل اللہ قرار دی جائے گی۔ بہرحال یہ ہیں وہ مغالطے جو کچھ تو اغیار کی کرم فرمائی سے اور کچھ اپنوں کی ستم ظریفی سے تہہ در تہہ ذہنوں میں بیٹھ گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تصور کو نکھار کر سامنے لایا جائے کہ جہاد فی سبیل اللہ درحقیقت ہے کیا' اور جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ میں فرق کیا ہے!

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ ایک عام اردو دان کے لیے وہ لفظ کون سا ہوگا جو لفظ جہاد کے مفہوم کو صحیح صحیح ادا کر دے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ لفظ جہاد بابِ مفاعلہ سے ہے اور باب مفاعلہ کے اکثر مصادر میں فریقین کی شرکت ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرے پر غالب آنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہوتا ہے' جیسے بحث سے مباحثہ' جہد سے مجاہدہ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اور جہاد' اور قتل سے مقاتلہ اور قتال۔ قتال میں بات دوطرفہ ہو جاتی ہے جبکہ قتل یک طرفہ عمل ہے۔ کوئی شخص جا رہا ہے' کسی نے گولی مار دی یا خنجر گھونپ دیا درآنحالیکہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہو جائے گا' یہ قتل ہے۔ لیکن جب دو فریق آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہو جائیں تو یہ ان فریقین کے مابین قتال یا مقاتلہ ہے۔ اسی طرح جہد کا عمل ہے۔ یہ عام فہم لفظ ہے اور اردو میں کوشش کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس سے جہاد و مجاہدہ کے معنی و مفہوم ہوں گے کوششوں کا تصادم' کوششوں کا ٹکراؤ' کوششوں کا مقابلہ ___ جس کے لیے ایک لفظ ہو گا ''کشمکش'' یا ''کشاکش''۔ انگریزی میں اسے کہیں گے :struggle۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے بعد صلہ (preposition) کے طور پر against کا لفظ آتا ہے۔ یعنی کوئی رکاوٹ ہے یا کوئی چیز درمیان میں راستہ روکنے والی ہے تو اسے ہٹانے اور دُور کرنے کے لیے اس سے کشمکش کرنا۔ درحقیقت جہاد یا مجاہدہ کا صحیح صحیح لغوی مفہوم یہی ہے۔

فرائضِ دینی اور جہاد کی منازل

میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے اپنے غور و فکر کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کے نتیجے میں جہاد کے تین بڑے بڑے درجے اور ہر درجہ کے تین پہلو یا تین قسمیں میرے سامنے آئی ہیں ___ میں ان کو اہلِ علم کے سامنے ان کی تائید و توثیق یا اصلاح کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں' مجھے اہلِ علم کی رہنمائی حاصل ہونے پر دلی مسرت ہو گی۔ میں خلوصِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھ پر میری غلطی واضح کر دی جائے تو میں سرِ تسلیم خم کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تردّد نہیں کروں گا' بلکہ غلطی کی نشاندہی کرنے والے صاحب کا صمیم قلب سے احسان مند ہوں گا۔

میرے نزدیک یہ تین بڑے بڑے درجے ان بنیادی فرائض سے متعلق ہیں جو

© rasailojaraid.c

ہمارا دین اپنے ماننے والوں پر عائد کرتا ہے۔ دین کی طرف سے ہر مسلمان پر جو تین بنیادی فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بنیادی تفہیم کے لیے ایک تین منزلہ عمارت کی تمثیل یا تشبیہہ بہت ہی مفید ہے۔

پہلی منزل: عبادتِ ربّ

فرائض دینی کی پہلی منزل ہے خود اللہ کا بندہ بننا۔ اور یہ بندگی ہمہ وجوہ' ہمہ تن اور ہمہ وقت ہوگی' جزوی نہیں ہوگی۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے''۔

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَاَنِیْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾﴾ (الزمر)

''اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری قبول کرلو (اس کے سامنے سرتسلیم خم کردو) اس سے پہلے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے' پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔''

اس رویہ کا دینی اصطلاح میں نام ہے اسلام' سرتسلیم خم کرنا' گردن نہادن' to surrender۔ اسی کے لیے مزید دو اصطلاحات ہیں: اطاعت اور تقویٰ۔ اطاعت کا مفہوم ہے مقاومت و مدافعت ترک کر کے برضا و خوشی فرمانبرداری قبول کر لینا' جس کے لیے قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی''۔ اسے انگریزی میں یوں کہیں گے:

"To give up all kinds of resistance whole heartedly."

یعنی ''خوش دلی سے ہر نوع کی مقاومت و مزاحمت ترک کر دینا۔''

جبکہ ''تقویٰ'' کا مفہوم ہے اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا' اس کی نافرمانی سے باز رہنا۔ تقویٰ کا حکم قرآن مجید میں بڑی تکرار اور تاکید سے آیا ہے۔ اس ضمن میں

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c
© rasailojaraid

چوٹی کی آیت ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران)

''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم پر موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں۔''

اطاعت اور تقویٰ میں بالترتیب مثبت اور منفی رویہ سامنے آتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ گویا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

اس پہلی منزل کے لیے چوتھی اور آخری جامع ترین اصطلاح ہے ''عبادت''۔ اس میں اسلام، اطاعت اور تقویٰ کے تمام مفاہیم آ جاتے ہیں۔ اس لفظِ عبادت کے سمجھنے کے لیے فارسی کے دو الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں، جمع کریں گے تو مفہوم ذہن نشین ہو جائے گا۔ وہ الفاظ ہیں ''بندگی'' اور ''پرستش''۔ بندگی غلامی کو کہتے ہیں۔ اس میں اطاعت کا پہلو غالب ہے، جبکہ پرستش کے معنی ہیں مخلصانہ اور والہانہ محبت۔ سورۃ الزمر میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ﴾ ''پس (اے نبیؐ!) اللہ کی بندگی کیجیے اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ پھر سورۃ البیّنۃ میں ان دونوں کو نہایت حسین و جمیل اسلوبِ بیان میں بایں طور جمع کر دیا گیا: ﴿وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ......﴾ (آیت ۵) ''اور اُن کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین (اطاعت) کو اس (اللہ تعالیٰ) کے لیے خالص کرتے ہوئے، بالکل یکسو ہو کر''۔

قرآنِ مجید میں جن و اِنس کی تخلیق کی غایت یہی عبادتِ ربّ قرار دی گئی ہے، از روئے آیت مبارکہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ (الذّٰریٰت) ''میں نے جنوں اور انسانوں کو فقط اپنی بندگی کے لیے تخلیق کیا ہے''۔

فرائضِ دینی کی اس پہلی منزل کو سر کرنے کے لیے ایک بندۂ مومن کو سہ گونہ جہاد کرنا ہوگا یعنی مجاہدہ و کشمکش کرنی پڑے گی۔

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

پہلی منزل کے تین جہاد

اس پہلی منزل پر سب سے پہلے کشمکش کرنی پڑے گی اپنے نفس سے۔ نفس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے''۔ ''اَمَّارَۃ'' اَمر سے مبالغہ کا صیغہ ہے' یعنی بہت ہی زیادہ اکسانے والا' نہایت سختی سے حکم دینے والا۔ لہٰذا اللہ کا بندہ بننے کے لیے پہلی کشمکش خود اپنے نفس کے ساتھ کرنی پڑے گی۔ ایک حدیث میں نفس کے خلاف جہاد کو ایک اعتبار سے ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِیْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰی))(۱) ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو''۔ حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ))(۲) ''اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے''۔ پس پہلی کشمکش ہر اُس شخص کو اپنے نفس سے کرنا ہوگی جو واقعتاً اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے۔ اسی نفس کے متعلق مولانا رومؒ نے کیا خوب بات کہی ہے:

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن اُو را عون ایں را عون نیست!

یعنی میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ فرعون کے پاس لاؤلشکر تھا لیکن اس کے پاس لاؤلشکر نہیں ہے' ورنہ میرا نفس اندر سے وہی کچھ دعویٰ کر رہا ہے جو فرعون نے کیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا ملکِ مصر کے بارے میں: ﴿اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ (الزخرف:۵۱) ''کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے؟'' اسی طرح میرا نفس میرے وجود پر حکومت کا دعوے دار ہے۔ پس سب سے پہلا اور سب سے بڑا جہاد

---

(۱) رواہ الدیلمی' بحوالہ کنز العمال ۲۶۹/۴۔

(۲) سنن الترمذی' ابواب فضائل الجہاد۔

© rasailojaraid.com

''مجاہدہ مع النفس'' ہے۔ جس نے اس منزل کو سر نہیں کیا اور وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے تو میرے نزدیک اس کے لیے ہلکے سے ہلکا لفظ ''حماقت'' ہے۔

نفس امّارہ کو تقویت دینے کے لیے ایک طاقت موجود ہے' وہ ہے شیطانِ لعین اور اس کی صلبی و معنوی ذریت۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اِس نفس کو تقویت پہنچائے' اس میں پھونکیں مارے اور اس میں جتنے بھی سفلی محرکات ہیں انہیں مشتعل کرے۔ ایک حدیث کی ابتدا میں الفاظ آتے ہیں:

((اِنَّ اِبْلِیْسَ لَہٗ خُرْطُوْمٌ کَخُرْطُوْمِ الْکَلْبِ وَاضِعُہٗ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ یُذَکِّرُ الشَّھَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ وَیَاْتِیْہِ بِالْاَمَانِیِّ وَیَاْتِیْہِ بِالْوَسْوَسَۃِ عَلٰی قَلْبِہٖ لِیُشَکِّکَہٗ فِیْ رَبِّہٖ))

''ابلیس کی تھوتھنی ہے کتے کی تھوتھنی کی طرح۔ وہ اسے ابن آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے اور اسے خواہشاتِ نفس اور مرغوب چیزوں پر اُبھارتا ہے' وہ اس کو لمبی لمبی امیدیں (wishful thinking) دلاتا اور اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے' تاکہ اسے اپنے ربّ کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کردے''۔

ایک اور متفق علیہ حدیث ہے:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ))(۱)

''شیطان انسان کے اندر خون کی مانند دوڑتا ہے۔''

قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بے شمار مقامات پر شیطان کے اغوا اور فریب سے خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا﴾ (فاطر:٦) ''(لوگو!) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے' پس تم بھی اسے دشمن سمجھو

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب زیارۃ المرأۃ زوجھا فی اعتکافہ۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب بیان انہ یستحب لمن رؤی خالیا بامرأۃ وکانت زوجتہ او محرما لہ ان یقول : ھذہ فلانۃ ' لیدفع ظن السوء بہ۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الصیام' باب المعتکف یدخل البیت لحاجتہ۔

© rasailojaraid.c

(دشمن جانو)۔'' اور سورۃ الکہف میں بڑا پیارا انداز ہے' جس میں ایک لطیف سا طنز بھی موجود ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾

''اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ جنوں میں سے تھا' سو اُس نے اپنے ربّ کے حکم سے روگردانی کی۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت (صلبی و معنوی) کو اپنا دوست بنا رہے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ایسے ظالموں کے لیے بہت ہی برا بدلہ ہے''۔

چنانچہ کشمکش کرنا ہوگی' مجاہدہ کرنا ہوگا شیطان اور اس کی صلبی و معنوی ذریت کے ساتھ اور اس کو شکست دینا ہوگی۔ اس لفظ ''شکست'' سے میرا ذہن اچانک علامہ اقبال کے فارسی کلام میں اُن کی نظم ''نالۂ ابلیس'' کی طرف منتقل ہوا جو مجھے بہت پسند ہے۔ شیطان اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے کہ پروردگار! یہ انسان تو میری چوٹ کا نہیں' میرے مقابلے کا نہیں' ایک مشتِ خس ہے جس کے لیے میری ایک چنگاری کافی ہے۔ اس انسان کو اگر سوکھی گھاس ہی بنانا تھا تو مجھ میں اس قدر تیز و تند آگ رکھنے کا کیا فائدہ ہوا!

ابنِ آدم چیست؟ یک مشتِ خس است! ۔۔۔ مشتِ خس را یک شرار از من بس است
اندریں عالم اگر جز خس نبود ۔۔۔ ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟

نظم کا آخری شعر تڑپا دینے والا ہے۔

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست ۔۔۔ لذتے شاید کہ یابم در شکست!

''الٰہی! کوئی تو زندہ مردِ حق پرست ایسا ہو جو مجھے شکست دے دے' تاکہ میں بھی تو کبھی شکست کا لذت آشنا ہو سکوں''۔

تو دوسری کشمکش اور دوسرا مجاہدہ یہ ہوگا۔

© rasailojaraid.com

تیسری کشمکش ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا جو سماجی دباؤ (social pressure) ہے' اس سے ہو گی۔ معاشرے کا دباؤ آپ کو ایک خاص رُخ پر دھکیلے گا۔ اس لیے کہ ایک ہجوم جس سمت میں جا رہا ہو اُس سمت میں چلنا بہت آسان ہے۔ آپ کو کوئی زور نہیں لگانا پڑے گا' وہ آپ کو خود دھکیل کر لے جائے گا۔ ؏

''زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز!''

''زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تم اس کے ساتھ موافقت کر لو!''

اس طرح کوئی تصادم نہیں ہو گا' کوئی کشمکش نہیں ہو گی' کوئی مزاحمت نہیں ہو گی۔ دُنیوی نقطۂ نظر سے عافیت اسی میں ہے' چین اور سکون سے زندگی بسر ہو گی کہ زمانہ تم سے موافقت نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ موافقت کر لو۔ لیکن غیرت و حمیت کا تقاضا بالکل برعکس ہے ؏

''زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!''

''زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم اس سے لڑو!''

پس دینی فرائض کی پہلی منزل پر تین اطراف و جوانب میں یہ تین کشمکشیں ہیں جو ہر اُس شخص کو کرنی ہوں گی جو واقعتہً اللہ کا بندہ بننے کا ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

دوسری منزل: شہادت علی الناس

فرائض دینی کی دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا' دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا۔ اس کے لیے چار اصطلاحات اہم ہیں۔ پہلی دو اصطلاحات ہیں: ''تبلیغ'' اور ''دعوت''۔ یہ بھی اطاعت و تقویٰ کی طرح تصویر کے دو رُخ اور مثبت و منفی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ تبلیغ سے مراد پہنچانا اور دعوت سے مراد لوگوں کو کھینچ کر راہِ حق پر لے آنا ہے۔ یہ بھی ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ تبلیغ کے لیے نبی اکرم ﷺ کو یہ تاکیدی حکم ہوا:

﴿یٰٓاَیُّہَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ؕ﴾ (المائدۃ:٦٧)

''اے رسول (ﷺ)! پہنچا دیجئے جو آپ کی طرف آپ کے ربّ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو (گویا) اپنی رسالت کا حق

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

ادا نہ کیا۔‘‘

نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اُمّت کو جو آخری تاکیدی حکم دیا وہ اسی تبلیغ کا تھا۔ فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ’’پس جو موجود ہے (مخاطب ہے) اسے چاہیے کہ (یہ پیغام) اس کو پہنچائے جو یہاں موجود نہیں ہے!‘‘ مزید برآں آنحضور ﷺ نے یہ فرما کر ہر مسلمان کے لیے فریضۂ تبلیغ آسان ترین فرما دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً)) ’’میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو‘‘۔ دعوت کے لیے نبی اکرم ﷺ کو تاکیدی حکم ہوا:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (النحل:۱۲۵)

’’(اے نبیؐ!) اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلایئے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان (کفار و مشرکین) کے ساتھ مجادلہ کیجیے احسن طریقے سے۔‘‘

یہ بڑی مہتم بالشان آیت ہے‘ اس پر میں بعد میں کچھ عرض کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں دعوت کی تین سطحیں (levels) بیان ہوئی ہیں۔

دعوت کے ضمن میں ایک مزید اٹل اور رہنما اصول اس آیت مبارکہ میں بیان کر دیا گیا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

’’اور اُس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے یقیناً میں خود بھی فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں سے ہوں!‘‘

یعنی دعوت اللہ کی طرف ہو‘ اس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت و کردار عملِ صالح کا مظہر ہو۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے‘ مسلمان کہلائے۔ اس کی دعوت کسی فقہی مسلک کی طرف نہ ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو۔ جو شخص اللہ کی طرف دعوت دے اس سے بہتر بات اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔

© rasailojaraid

اسی دوسری منزل کے لیے دو اصطلاحات مزید ہیں جو بڑی اہم ہیں' لیکن ان کا ادراک وشعور قریباً معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں' الاّ ماشاء اللہ' چند ہی لوگ ہوں گے جو اِن کی اہمیت کو سمجھتے ہوں گے اور ان پر عمل کرتے ہوں گے۔ ان میں تیسری اصطلاح ہے: ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر''یعنی نیکیوں کا پرچار' اُن کی تلقین' اُن کا حکم اور برائیوں سے' بدی سے لوگوں کو روکنا' بدی اور برائی کے راستہ میں آڑے آنا۔ ہماری ایک دینی تحریک میں امر بالمعروف پر ایک درجہ میں عمل بھی ہو رہا ہے تو اس میں نہی عن المنکر سے صرفِ نظر ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں نہی عن المنکر پر زیادہ زور اور تاکید ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ ، فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ ، وَذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ))(۱)

''(اے مسلمانو!) تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے روکے' اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے (یعنی نصیحت وتلقین کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو (کم ازکم) دل میں اسے برا جانے (اس پر کڑھے اور پیچ وتاب کھائے) اور یہ کمزور ترین ایمان (کی نشانی) ہے۔''

ہمارے اس دَور کے لحاظ سے مسلم شریف کی ایک اور حدیث بہت اہم اور قابل التفات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ أُمَّةٍ قَبْلِيْ إِلَّا كَانَ لَهُ فِيْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّوْنَ وَأَصْحَابٌ يَأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهِ ، ثُمَّ إِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهِ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْإِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ))(۲)

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان (۲) حوالہ سابقہ

© rasailojaraid.com

''مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا' اس کی امت میں اس کے ایسے حواری اور ساتھی ہوا کرتے تھے جو اس نبی کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن حواریین کے بعد ایسے نالائق جانشین آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کیا کرتے تھے جن کا انہیں (اللہ کی طرف سے) حکم نہیں ہوا کرتا تھا۔ تو ایسے لوگوں سے جو ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے' اور جو زبان سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور جو دل سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور اس کے ورے تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

یہ ہے ہمارے دین میں نہی عن المنکر کی اہمیت۔

اس دوسری منزل کے لیے چوتھی جامع ترین اصطلاح ہے ''شہادت علی الناس''۔ جیسے پہلی منزل کے لیے جامع ترین اصطلاح میں نے ''عبادت'' بیان کی تھی' دوسری منزل کے لیے ''شہادت علی الناس'' جامع ترین اصطلاح ہے۔ جناب محمد ﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ لہٰذا آپؐ کی اُمت بھی آخری اُمت ہے۔ یہ اُمت اس لیے برپا کی گئی ہے کہ تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اس طرح (اے مسلمانو!) ہم نے تمہیں بہترین امت بنایا ہے تاکہ تم نوعِ انسانی پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائیں۔''

سورۃ الحج کی آخری آیت اس موضوع پر بڑی عظیم آیت ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾

''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ (اور جتنا کہ) اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے (پسند کر لیا ہے' ایک خاص مقصد کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے)۔''

درمیان میں ایک جملہ معترضہ ہے:

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾

اس کے بعد اُمت کے اجتباء (چن لیے جانے) کا مقصد بایں الفاظ بیان ہوا:

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾

''تا کہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم پوری نوعِ انسانی کے لیے گواہ بن جاؤ''۔

یعنی لوگوں پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے کر حجت قائم کرو تا کہ قیامت کے دن عدالتِ خداوندی میں گواہی دے سکو' testify کر سکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین ان تک پہنچا دیا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت میں پہلے اُمت کا ذکر ہوا اور پھر رسول کا' لیکن یہاں پہلے رسولؐ اور پھر اُمت کا ذکر ہے۔

شہادت علی الناس وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تعلق کارِ رسالت سے جڑ جاتا ہے۔ چونکہ آنحضورﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں لہٰذا یہ آپؐ کی ذمہ داری ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے اور اپنے قول و عمل کی ہم آہنگی کی شہادت کے ذریعے ''دین الحق'' کو بالفعل قائم کر کے اس کی برکات کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم کریں۔ اس شہادت کی اہمیت کا اندازہ سورۃ النساء کی اس آیت سے لگایئے' فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ﴾ (النساء)

''اس دن کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے' اور (اے نبیؐ!) ان سب پر آپؐ کو گواہ بنا کر لائیں گے!''

عدالتِ خداوندی میں رسولؐ دراصل استغاثہ کے گواہ ہوں گے' وہ کہیں گے اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام اپنے قول و عمل سے شہادت دیتے ہوئے بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر اُن پر حجت قائم کر دی تھی۔ رسول اللہﷺ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ہے۔

شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی نزاکت کو سمجھ لیجیے۔ اگر بالفرض رسولؐ اللہ

© rasailojaraid.c

تعالیٰ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے یہاں وہ مسئول ہوتے۔ انہوں نے پہنچا دیا تو وہ بری ہو گئے۔ اب لوگ جواب دہ ہوں گے۔ (۱) نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ کے مجمع سے گواہی لے لی: اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟ اور پورے مجمع نے بیک زبان ہو کر گواہی دی: قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔ تین بار یہ سوال و جواب ہوئے۔ اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف، پھر مجمع کی طرف اپنی انگشتِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ اُمت کا اجتباء جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر اُمت نے اس شہادت علی الناس کا فریضہ انجام نہیں دیا تو بنی نوعِ انسان کی گمراہی کے وبال سے عدالتِ خداوندی میں بچنا محال ہو جائے گا اور نبی اکرم ﷺ کی گواہی ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

دعوت و تبلیغ کی تین سطحیں

© rasailojaraid.c

اس تبلیغ و دعوت کی بھی تین سطحیں ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس مغالطہ میں مبتلا رہیں کہ ہم تو تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں، درآں حالیکہ وہ صورتِ تبلیغ ہو، حقیقی تبلیغ نہ ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ الحمد للہ اس دور میں ایک خاص سطح پر تبلیغ و دعوت کے لیے ایک بہت وسیع حرکت ہو چکی ہے۔ اس کے حجم کا جہاں تک تعلق ہے وہ بڑا متاثر کن ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اس گلوب پر ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ لیکن میں پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ تبلیغ اور دعوت کے لیے اگر ہم نے قرآنی ہدایات کو اپنا امام نہ بنایا اور ان کے مطابق کام نہ کیا جا سکا تو مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ اس ضمن میں وہی دو آیات دوبارہ ملاحظہ کیجیے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پہلی آیت ہے:

---

(۱) یہی بات سورۃ الاعراف میں اس اسلوب سے بیان فرمائی گئی:

﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾

''پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے، کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور رسولوں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں اور ان کو کیا جواب ملا)''۔ (جمیل الرحمٰن)

© rasailojaraid.c

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ (المائدۃ:٦٧)

اس آیتِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کو جس تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے وہ قرآن مجید ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ﴾ یعنی ''تبلیغ کیجیے اس کی (یعنی قرآن کی) جو آپ پر اتارا گیا ہے آپ کے ربّ کی جانب سے''۔ پس تبلیغ کا اصل محور و مرکز قرآن مجید ہونا چاہیے۔ پھر حضور ﷺ کے ارشادِ مبارک نے ہر مسلمان کے لیے قرآن حکیم کی تبلیغ کے کام کو آسان بنا دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً)) ''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ۔'' یہاں ''عَنِّيْ'' کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یہ لفظ یہاں جس معنی و مفہوم کا حامل ہے اسے انگریزی میں ادا کیا جائے تو وہ ہوگا ''on my behalf''۔ قرآن مجید کی تبلیغ کی اصلاً ذمہ داری ہے نبی اکرم ﷺ کی۔ چنانچہ اسی آیتِ مبارکہ کے اگلے حصہ میں فرمایا: ﴿وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ ''اور اگر آپ (ﷺ) نے بالفرض یہ کام نہیں کیا تو آپؐ نے تبلیغِ رسالت کا حق ادا نہ کیا۔'' میں نے ترجمہ میں لفظ ''بالفرض'' کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ذرا سا یہ گمان کہ آپ قرآن حکیم کی تبلیغ میں کوتاہی فرمائیں گے' ایمان کے منافی ہو جائے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ یہ اسلوبِ بیان درحقیقت امت کے انتباہ (warning) کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ کہیں وہ اس ذمہ داری سے غافل نہ ہو جائے جو پوری اُمت پر بحیثیت کُل اور ہر مسلمان پر بحیثیت اُمتیٔ رسولؐ عائد ہوتی ہے۔

دوسری آیت جس کی تفصیل میں نے مؤخر کر دی تھی' اس کے حوالے سے دعوت کی تین سطحوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ آیت مبارکہ ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ﴾ (النحل:١٢٥)

''(اے نبیؐ) دعوت دو اپنے ربّ کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی کے ساتھ'

© rasailojaraid.com

اور عمدہ وعظ و نصیحت کے ساتھ' اور (ہٹ دھرم' ضدی اور حجتی) لوگوں کے ساتھ مجادلہ کرو اس طریق پر جو بہت ہی عمدہ ہو۔"

ہر دور اور ہر معاشرے میں آپ کو لوگوں کی تین سطحیں ملیں گی۔ ایک سب سے بلند سطح کے لوگ ہوتے ہیں' یعنی ذہین اقلیت (intellectual minority)۔ اسی کو intelligentsia بھی کہتے ہیں۔ یہی brain trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ اگرچہ قلیل ترین اقلیت میں ہوتا ہے لیکن معاشرے میں مؤثر ترین ہوتا ہے اور معاشرے کا رُخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے انسان کے جسم میں دماغ ہے جو وزن کے لحاظ سے کم و بیش آدھ سیر کا ہوگا' لیکن یہ اس کے پورے وجود اور پورے تن و توش کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہاتھ پکڑ سکتا ہے' لیکن کس شے کو پکڑے' کس کو نہ پکڑے' اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا' اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ ٹانگیں اسے لے کر چل سکتی ہیں' لیکن کس طرف چلیں' کس طرف نہ چلیں' اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا رُخ درحقیقت یہی ذہین اقلیت متعین کرتی ہے۔ اس کو جب تک دعوت دینے کا تقاضا دلیل کے ساتھ' برہان کے ساتھ پورا نہیں کیا جائے گا' یہ طبقہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ جیسے قرآن حکیم یہود کو کھلا چیلنج کرتا ہے:

﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (البقرۃ)

"(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو"۔

اگر اس ذہین اقلیت کو اعلیٰ علمی و فکری سطح پر مدلل طور پر آپ دین کی دعوت پیش نہیں کریں گے اور اسے by pass کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ذہین اقلیت دین کے حق میں ہموار نہ ہو سکے گی۔ اگرچہ by pass دل کے آپریشن میں بہت مفید ہوتا ہے' لیکن اسلامی انقلابی عمل میں یہ طرزِ عمل بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جا رہی ہے لیکن ذہین اقلیت میں وہ بار نہیں پا رہی تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا' اجتماعی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لہٰذا یہاں ہدایت آئی: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ﴾ "اے نبی! (لوگوں کو) حکمت کے ساتھ اپنے ربّ کے راستے کی طرف

© rasailojarai
© rasailojarai

دعوت دیجیے''۔ اس حکمت کے ساتھ جس کے متعلق ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''اور جس کو حکمت و دانائی ملی' اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی (بہت خیر مل گیا)۔'' مجھے بڑا افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے یہاں ''حکمت'' کو حکمتِ عملی کے معنی میں لے کر اس آیتِ مبارکہ کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ حکمتِ عملی بالکل دوسری چیز ہے' اگرچہ وہ بھی یقیناً مطلوب شے ہے' لیکن یہاں جس شان کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے' درحقیقت اس کا مفہوم حکمت عملی نہیں ہے' بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ' دانائی کے ساتھ' اس دعوت کو پیش کرنا ہے۔ اگر سوسائٹی کی ذہین اقلیت کو اِس وقت اور اس دَور کی اعلیٰ علمی و فکری سطح پر دعوت پیش نہ کی جا سکے تو معاشرہ بحیثیتِ مجموعی کبھی متاثر نہیں ہو سکتا۔

دعوت کی دوسری سطح ''عوامی'' ہے۔ عوام کو دعوت عمدہ وعظ اور دل نشین نصیحت کے ذریعے دی جائے گی' کیونکہ انہیں کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے لیے ضرورت ہے موعظہ حسنہ کی' وہی ان کے لیے کفایت کرے گی۔

اس سطح پر یہ بات نہایت اہم ہے کہ سننے والے یہ محسوس کریں کہ جو وعظ کر رہا ہے وہ ہم پر اپنی دین داری' علمیت اور شخصیت کی دھونس نہیں جمانا چاہتا' بلکہ وہ مخلص ہے اور ہماری خیر خواہی کے لیے بات کہہ رہا ہے۔ اسے کسی دُنیوی اجر اور صلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ بہروپیا نہیں ہے' ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ والا معاملہ نہیں ہے' بلکہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں' ایک موعظہ حسنہ اور دوسرے واعظ کا اعلیٰ کردار تو معاملہ ہوگا: از دل خیزد بر دل ریزد' اور ع

''دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!''

یہ ہے عوامی سطح پر دعوت و تبلیغ۔ میں جانتا ہوں کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے ایک بڑے طبقے میں عام طور پر وعظ کو ایک گالی کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ بڑے ہی استحقار کے انداز میں کہا جاتا ہے ''اجی وعظ کہہ رہے ہیں''۔ حالانکہ

© rasailojaraid
© rasailojaraid

وعظ بڑی عظیم اور مؤثر شے ہے اور قرآنی اصطلاح ہے' لیکن اس کا ایک مقام اور محل ہے جہاں یہ تأثیر دکھاتا ہے۔ یہ عمل غیر موقع اور بے محل ہوگا تو غیر مؤثر رہے گا۔ ظلم کا مطلب ہی یہ ہے: وَضۡعُ الشَّیۡءِ فِیۡ غَیۡرِ مَحَلِّہٖ۔ یعنی ''کسی چیز کو اپنے اصل مقام کی بجائے کسی اور جگہ رکھنا''۔ ان عوام کو آپ فلسفہ پڑھائیں گے تو حماقت ہوگی اور intellectuals کو آپ وعظ پلائیں گے تو یہ کام بھی غیر معقول ہوگا۔ ہر شے کو اپنی جگہ پر رکھنا ہی عدل ہے۔

تیسری سطح جو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے' وہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہٹ دھرم ہوتے ہیں' جو کبھی مان کر نہیں دیتے' جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں' جن کی امداد باہمی کی انجمنیں بنی ہوتی ہیں' جن کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کی وجہ سے کور چشم ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات علیٰ وجہ البصیرت لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے زہر کا تریاق فراہم نہ کیا جائے تو یہ عوام الناس کو گمراہ کرتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں مناظرہ کا فن وجود میں آیا۔ پھر اس نے باقاعدہ ایک خاص تکنیک اور تخصص (Specialization) کی شکل اختیار کی۔ موجودہ دور میں کچھ لوگوں نے اسے پیشہ ہی بنا لیا تو اس میں چند خرابیاں در آئیں۔ مثلاً مجمع عام ہے' داد مل رہی ہے' تحسین ہو رہی ہے' تالیاں بج رہی ہیں' نعرے لگ رہے ہیں۔ گویا اتنی بڑی جیوری (Jury) ہے جس کے سامنے دو پہلوان عقلی کشتی لڑ رہے ہیں۔ یہ مناظرہ اور مجادلہ کا احسن انداز نہیں۔ قرآن مجید جسے مجادلہ کہتا ہے وہ احسن طریق پر محکم دلائل اور براہین کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

دعوت کی یہ تیسری سطح لازمی ہے۔ اگر یہ کام آپ نہیں کریں گے تو اغیار سے شکست کھا جائیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہم کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگاتے رہے اور فقہی تعبیرات' راجح و مرجوح' افضل و مفضول کے ردّ و قبول میں آپس میں ہی مناظرے اور

© rasailojaraid
© rasailojaraid

دنگل جماتے رہے اور جما رہے ہیں‘ جبکہ اندر ہی اندر عیسائیت دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح دعوتی سطح پر اس دور میں قادیانیت بہت فعّال ہوگئی ہے[1]۔ قادیانی مبلغین کا انداز بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور ایک عام آدمی تو کجا اچھا بھلا پڑھا لکھا‘ بلکہ عالمِ دین بھی ان کے مناظرین و مبلغین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ ان قادیانی مناظرین و مبلغین کو جس طرح خاص موضوعات پر تربیت دی گئی ہے‘ اس کے ردّ اور ابطال کے لیے جب تک ہمارے ذہین و فطین لوگوں کو اسی طرح ٹریننگ نہ ملے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ایک وقت میں جب یہاں انگریزی حکومت کی سرپرستی میں بڑے زور و شور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تھی اور پادری فینڈر نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا‘ اگر اُس وقت وہ مردِ حق کھڑا نہ ہوگیا ہوتا جس کا نام نامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہے‘ رحمۃ اللہ علیہ‘ تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں مسلمان کس طرح عیسائیت کے اس سیلاب کی نذر ہو جاتے۔ اس پادری فینڈر نے پورے ہندوستان کے علماء کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر للکارا اور کھلے طور پر دعوتِ مبارزت دی۔ مولانا کیرانوی ؒخم ٹھونک کر میدان میں آئے اور پادری فینڈر کو میدان چھوڑ کر ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ پھر وہ ترکی پہنچا اور وہاں بھی اس نے یہی ہتھکنڈے شروع کیے۔ عثمانی سلطنت نے مولانا کیرانویؒ کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو پادری فینڈر وہاں سے بھی فرار ہوگیا۔ تو دعوت کی یہ بھی ایک سطح ہے۔ یہ تیسری سطح ہے۔ کچھ لوگ اس کا تحقیر کے انداز میں ذکر کرتے ہیں‘ حالانکہ یہ بھی کرنے کا کام ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن اس کے لیے ہمیں ایک امتیازی اخلاقی معیار قائم رکھنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾۔ یعنی اس مجادلے میں بھی بالکل مخالفین کی سطح پر نہ اتر آؤ‘ بلکہ تمہارا داعیانہ کردار اور اس کی ایک اخلاقی شان ضرور برقرار رہنی چاہیے۔

ظاہر بات ہے کہ ایک شخص ان تینوں سطحوں پر کام نہیں کر سکتا۔ ہر کام کے اپنے

---

(۱) یہ تقریر قادیانیوں کے بارے میں صدارتی آرڈیننس سے قبل کی ہے۔ (مرتب)

© rasailojaraid.

اپنے تقاضے ہیں۔ جو سب سے اونچا کام ہے اس کے لیے اس دور میں ''علم کو مسلمان بنانے'' کی ضرورت ہے۔ آج علم ملحد ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری بات علامہ اقبال نے کہی ہے ۔

عشق کی تیغِ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

معرفتِ خداوندی کی تلوار اس علم کی نیام میں سے نکل گئی ہے۔ یہ نرا خول ہے' اور محض خالی نہیں ہے' بلکہ اس میں الحاد کا خنجر اس تلوار کی جگہ پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس علم کو مسلمان بنانا آسان نہیں ہے۔ لوگ نظامِ تعلیم کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ نظام اتنی بڑی بات نہیں ہے' یہ تو تعلیم دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی علم کہاں ہے جسے پہنچایا جائے؟ محض دینیات کا ایک پیریڈ یا اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کرنے سے کام نہیں چلے گا' جبکہ طبیعیات' معاشیات' عمرانیات' سیاسیات اور جو دوسرے علوم ایک طالب علم حاصل کر رہا ہے' ان کے رگ و پے میں الحاد اور مادہ پرستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

توحید کی بنیاد پر جب تک پورے علم کی تدوینِ نو نہیں ہو گی' تمام علوم کو جب تک مسلمان نہیں بنایا جائے گا' ہماری نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک سینکڑوں اور ہزاروں اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَہٗ)) کو اپنا اصولِ عمل (Motto) بنا کر میدان میں نہیں آئیں گے اور ان کو اداروں اور حکومت کی جانب سے مناسب ذرائع مہیا نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک یہ کام کیسے ہو گا! ہاں وعظ کی سطح پر ہمیں زیادہ جوہر قابل (Talent) مل سکتا ہے۔ رہا مجادلہ کی سطح پر افراد کی ضرورت تو اس کے لیے خصوصی تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔

© rasailojaraid.

دعوت کی تینوں سطحوں پر کام کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ باصلاحیت نوجوان جن کے دل میں واقعی دین کا کام کرنے کی تڑپ ہے' ولولہ ہے' اُمنگ اور جذبہ ہے' وہ آگے بڑھیں' ان اعلیٰ وارفع مقاصد کے لیے اپنا دُنیوی کیریئر قربان کریں اور اپنی جانیں ان مقاصد کے حصول میں کھپائیں' تب جا کر ہی یہ کام ہو گا۔ اور یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل —— دین کی تبلیغ اور دعوت کے لیے مال و جان کو ان تینوں سطحوں پر کھپانا۔

عجب حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے نہی عن المنکر سے متعلق جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان میں نہی عن المنکر کے کام کی انجام دہی کے لیے تین سطحوں ہی کا بیان ہوا ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ بدی اور برائی کو ہاتھ یعنی قوت و طاقت سے روک دینا۔ دوسری یہ کہ اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے وعظ سے اور تلقین و نصیحت سے اس کو روکنا' اس کی مذمت کرنا۔ اور تیسری سطح یہ ہے کہ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننا' اس پر گھٹن محسوس کرنا' اس پر پیچ و تاب کھانا۔ اور یہ آخری سطح ایمان کے کمزور ترین ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری حدیث میں ان تینوں سطحوں کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ''جہاد'' کا لفظ استعمال فرمایا۔

اس دوسری منزل کے لیے ایک دوسرا عنوان ''نظریاتی کشمکش'' یا ''فکری تصادم'' ہے۔ اگر آپ توحید کو پھیلانا چاہتے ہیں تو مشرکانہ اوہام رکھنے والے موجود ہیں' ان سے نظریاتی سطح پر تصادم اور مقابلہ ہو گا۔ آپ کو walk over نہیں مل جائے گا۔ کس قدر اہم بات ہے کہ قرآن مجید نے یہی لفظ ''جہاد'' مشرک والدین کے ضمن میں دو جگہ استعمال کیا ہے' ایک سورۃ لقمان میں اور دوسرے سورۃ العنکبوت میں۔ جو نوجوان نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے تو ان کے مشرک والدین ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ واپس اپنے آبائی دین پر آ جائیں۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنْ تُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

معلوم ہوا کہ مشرک بھی مجاہد تھے۔ وہ مجاہد فی سبیل الشرک اور مجاہد فی سبیل الطاغوت

© rasailojaraid.

تھے اور نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم بھی مجاہد تھے اور وہ تھے مجاہد فی سبیل اللہ اور مجاہد فی التوحید۔ یہ جہاد اور یہ کشمکش آپ کو ہر دور میں ملے گی اور یہ بات بغیر استثناء کے حقیقتِ نفس الامری ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

تیسری منزل۔غلبہ واقامتِ دین

جہاد کی تیسری منزل سب سے کٹھن‘ سب سے بھاری اور سب سے مشکل ہے۔ اور یہ ہے دین کو غالب کرنے‘ قائم کرنے اور نافذ کرنے کے لیے‘ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے‘ اس مقصد کے لیے کہ دین کا تجزیہ اور اس کے حصے بخرے کیے بغیر وہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے جہاد کرنا۔ جیسے انفرادی سطح پر فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ﴾ ویسے ہی اجتماعی سطح پر دین کے غلبہ کے لیے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا۔ فرمایا: ﴿وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ﴾۔ یہ ہے جہاد کی بلندترین چوٹی اور سب سے کٹھن اور مشکل مرحلہ۔ اس کی وجہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ پہلی منزل پر ذاتی سطح پر نفس کے ساتھ کشمکش تھی۔ دوسری منزل پر اہل زیغ کے ساتھ نظریاتی اور فکری سطح پر کشمکش تھی۔ اس تیسری منزل پر طاغوتی نظام کو ہٹانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے‘ اس لیے کہ دو نظام کسی حال میں بھی co-exist نہیں کر سکتے۔ پچاس مذاہب بھی ایک بالاتر نظام کے تحت اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مذاہب باہمی اختلافات کے علی الرغم پُرامن طور پر پہلو بہ پہلو زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ بالکل قابلِ عمل ہے —— اس لیے کہ دنیا کا غالب تصور یہی ہے کہ مذہب تو لوگوں کے انفرادی اور نجی مسائل و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اجتماعیات کے تمام امور میں مذہب کا عمل دخل اِس دور میں تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ سیکولر فیلڈ ہے۔ جیسا کہ انگریز کے دور میں ہندوستان میں اصل نظامِ اجتماعی (Law of the Land) سرکارِ انگلشیہ کا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے شخصی

© rasailojaraid
© rasailojaraid

معاملات میں اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں۔ انگریزی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جیسے دستوری اور نظری طور پر موجودہ بھارت میں بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے اور تمام مذاہب کے حقوق دستور میں معین ہیں۔

بہر حال ایک ملک میں دین یعنی نظامِ اجتماعی ایک ہی رہ سکتا ہے۔ دو نظام نہ رہ سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔ جس طرح ایک نیام میں بیک وقت دو تلواریں نہیں سما سکتیں، اسی طرح ایک ملک میں دو نظام نہیں چل سکتے۔ ایک گدڑی میں بہت سے درویش سما سکتے ہیں، لیکن ایک شال میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہر نظام اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں، بلکہ دین ہے، جیسا کہ فی الواقع وہ ہے: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ قف﴾ تو اس کو غلبہ درکار ہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اب بھی بڑی مشکل سے یہ تصور لوگوں کے ذہنوں کے سامنے آ رہا ہے۔ چونکہ غلامی کے تقریباً دو سو سال کے درمیان اسلام دین نہیں رہا تھا، صرف مذہب بن گیا تھا، لہٰذا ہمارا سارا تصور اکثر و بیشتر تو پہلی منزل تک محدود ہے، یعنی عبادات اور حلال و حرام کے موٹے موٹے احکام ہم جانتے ہیں۔ دوسری منزل کی طرف بھی پیش رفت ہوئی، یعنی تبلیغ، دین کو پہنچانا، اسے عام کرنے کی کوشش کرنا۔ لیکن یہ بات ذہنوں سے اوجھل ہو گئی کہ ہمارا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْہِ۔ اسلام دین ہے اور دین ہوتا ہی وہ ہے جو غالب ہو۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

میں بڑے جزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے۔ ہماری دو سو سالہ سیاسی اور فکری غلامی نے اس مذہبی تصور کو اس طریقے سے ہمارے ذہنوں میں نقش اور راسخ کر دیا ہے کہ اگر بڑی محنت کے بعد کسی کے سامنے یہ تصور واضح ہوتا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ

© rasailojaraid

دین ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد مضمحل ہو کر ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر توجہ اس کے مذہبی تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارا اسلام کا محض مذہبی تصور انگریزی دَور میں اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ ہمارے بعض زعماء نے انگریز حکومت کی بھی بڑی مدح کی تھی کہ اس نے ہمیں بڑی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ لہٰذا حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلانا یا اس میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے قطعی نامناسب ہے۔ اسی پر مردِ قلندر اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اسلام کا غلبہ اور اسلام کا ایک دین کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ کرنا' یہ ہے ہمارے فرائض دینی کی تیسری اور بلند ترین منزل۔

(جاری ہے)

احیاء علوم

- ایک متحرک' اُمید افزا' زندہ جرید؛ جس کا دھارا روشن مستقبل کی طرف بہتا ہے
- ایک فکری سنگم' جہاں مذہب' فلسفہ اور سائنس آ کر ملتے ہیں
- علم دوست حضرات و خواتین کے لیے فکر انگیز اور معلومات افزا تحریروں کا انتخاب
- اسلام اور سائنس میں دوستی کروانے والی' کسی بھی زبان میں چھپنے والی' قدیم و جدید کتابوں کی تلخیصات' تعارفات' اقتباسات
- دنیا بھر کی احیائی تحریکوں کی اطلاعات' علوم جدیدہ میں ہونے والی تحقیقی و ترویجی سرگرمیاں

قیمت: 20 روپے ——— سالانہ: 200 روپے

ادارۂ نشأۃِ اسلامیہ
Institute of Islamic Renaissance
35-B. Iqbal Avenue, Johar Town II,
Lahore-54770, Pakistan
Tel: 042-5181643
e-mail: shahkarf@yahoo.com

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

© rasailojaraid